گردشِ رنگ چمن کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

A Postcolonial Study of the Novel Gardesh-e-Rang Chaman

یاسمین کوثر* / ڈاکٹر فہمیدہ تبسم**

Abstract:

Post Colonialism, an era that lasted for a few years but enslaved the colonizers for life long. This paper aims to investigate the ever-increasing post colonialism effects like trauma, identity crisis, Binaries resistance and sub alter, in the novel "Gardash-e-Range Chaman" by Qurat-ul-Ain Haider. The microscopic analysis of characters shows, how the various characters go through the ebb and flow. Their suffering, identity crisis, comparative analysis and resistance are the artistic depiction of post colonial legacy that can never be shaken off even after it is wrapped up.

نو آبادیاتی فکر کے حوالے سے گزشتہ کئی برسوں میں مشرق و مغرب کی کئی زبانوں میں اپنی ادبی تاریخ پر نظر ثانی کرنے اور ادب کو ثقافتی و تہذیبی مطالعہ کے طور پر دیکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اُردو میں نو آبادیاتی مطالعہ ایک نئی بحث ہے۔ اس کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں فرانز فینن کی کتاب "افتادگان خاک" سے ہوا۔ اس کے بعد ایڈورڈ سعید نے بھی اپنی تصانیف میں اس امر کی طرف توجہ دلائی۔

نو آبادیاتی نظام کا مطلب ہی ایسا نظام ہے جس میں کوئی طاقت ور ملک کمزور ملک پر اپنا عسکری، معاشی، سیاسی اور ثقافتی تسلط قائم کرتا ہے اور مقامی وسائل، اقدار، روایات، تمدن اور تہذیب پر قبضے اور مقامی لوگوں کے حقوق و وسائل کا استحصال کر کے اپنے آبادئی وطن کو معاشی طور پر مضبوط اور مستحکم کرتا ہے۔

---

*پی ایچ ڈی اسکالر، لیکچرار اُردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین و نہار بوچھال کلاں چکوال

**ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنسز و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

مابعد نو آبادیات کو اکثر اس کے لفظی معنوں میں لیا جاتا ہے یعنی نو آبادیات کے بعد کا دور۔ اس میں غلط فہمی موجود ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ ہم نے برطانیہ سے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی لیکن تہذیبی، ثقافتی اور سماجی لحاظ سے ترقی پذیر ممالک اب بھی مغربی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

"ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں لیکن انگریز یا نو آبادیاتی قوتیں یہاں سے بظاہر جانے کے باوجود یہیں موجود اور ہم پر قابض ہیں۔"(۱)

بے قید ہونا محض آزادی نہیں ہے۔ آزادی کا مطلب کسی ظلم، ڈر، خوف، صبر اور تشدد کے بغیر بلا روک ٹوک کے ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کے ہیں۔ موجودہ دور نو آبادیاتی نظام کا ہی تسلسل ہے۔ اگر ادب کی بات کریں تو آزادی کے بعد جو Tex لکھا گیا وہی مابعد نو آبادیات کا ادب ہو گا۔ مختلف نظریات جیسے ایڈورڈ سعید کا "شرق شناسی" فوکو کا نظریہ ڈسکورس اور دیگر نظریات بھی Post Colonial field of study کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔

مابعد نو آبادیات کے بہت سے نظریات جنہیں ادب میں زیرِ بحث لایا گیا ہے جیسے مقام و مقامیت کا مسئلہ، تشخص کا بحران، ہجرت، فکری یگانگی اور Self image کا بحران وغیرہ نو آبادیاتی عہد میں ہماری شناخت کو بُرے طریقے سے مسخ کیا گیا اور اس کا اثر ہمارے حافظے پر ہوا۔ اس دوران ادب میں کئی نئے نظریات سامنے آتے ہیں جیسے ماتحت بیانیہ, binary، مزاحمت، شناخت کا مسئلہ اور Trauma وغیرہ شامل ہیں۔ اب ہم ان نظریات کی طرف جاتے ہیں۔ ہم ان نظریات کو کسی ایک ادبی صنف کے ساتھ وابستہ کر کے جائزہ لیں گے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول گردشِ رنگِ چمن ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آیا۔ گردشِ رنگِ چمن کا عنوان غالب کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

عمر میری ہو گئی صرف بہار حسن
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سال عندلیب

اس ناول کا موضوع جو دراصل قدیم اور جدید کے درمیان کشمکش ہے جس کے نتیجے میں مختلف افراد ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

"گردشِ رنگِ چمن" معاشرے اور تہذیب کے لحاظ سے ایک کامیاب ناول ہے۔ یہ ناول معاشرے کی ان قدروں کا احاطہ کرتا ہے جو بیسویں صدی میں ہمیں مٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ناول میں ماضی اور حال کے وہ منظر نامے پیش کئے ہیں جن کے رنگوں پر گردشِ رنگ چمن کا انحصار ہے۔ مصنفہ نے ناول ہی نہیں لکھا بلکہ اپنے عہد کی معاشرت اور تہذیب کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

"جب کوئی شاعر یا ادیب اپنے تخلیقی اظہار کا استعمال کرتا ہے تو وہ اسے اس کی اصلی حالت میں نہیں برتتا بلکہ اکثر اس میں تنوع، جدت اور ندرت پیدا کرتا ہے۔"(۲)

قرۃ العین حیدر کا ناول "گردشِ رنگِ چمن" بھی ایک ایسا مطالعہ ہے جس کو نیم دستاویزی ناول کہا گیا ہے۔ یہ دستاویز ان اشخاص اور خاندان کے احوال کی ہے جن کی جڑیں قدیم جاگیر دارانہ ماحول کی پیداوار ہیں اور شاخیں اپنی برگ وبار کے ساتھ لہراتی نظر آتی ہیں۔ اس میں تقسیمِ ہند جنگ عظیم دوم کے اثرات بھرے پڑے ہیں جنہوں نے زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس تبدیلی میں نسلوں اور ہر نسل کے مرد وزن کا غلط ملط سب سے نمایاں عنصر ہے۔ نئے زمانے کے معاشرتی رجحانات کے ساتھ ساتھ ذہنی، روحانی اور اخلاقی میلانات اس عنصر کو نہایت پیچیدہ مرکب شکل میں پیش کرتے ہیں۔

"قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں رقص، موسیقی اور پینٹنگ وغیرہ کی باریکیاں موجود ہیں۔ ان کی تحریروں میں اتنے زیادہ خطے اور زندگی کی سطحیں تھیں کہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی واقفیت ہندوستان سے ہی نہیں بلکہ دنیا سے بہت گہری تھی اور پھر اپنے علم و آگہی کو فکشن کا رنگ دینا یہ ایک غیر معمولی خلاقانہ مہارت چاہتا ہے۔ وہ ان غیر معمولی مصنفین میں ہیں جن کے یہاں ذہن کی نشوونما ہمیشہ ہوتی رہی اور وہ کسی ایک منزل پر ٹھہری نہیں۔"(۳)

گردشِ رنگِ چمن کے کرداروں میں ڈاکٹر منصور کا شغری، ڈاکٹر عنبرین بیگ، عندلیب بانو، نگار خانم، شہوار خانم، دلنواز بیگم، مہر و بیگم، نواب فاطمہ، مرزا سبط احمد، شیخ عبد الباسط، عبد الباسط کا ملازم ممدو، اندرے رینال، منوری کشمیرن، گوہر جان، امباپرشاد، سید شکور حسین، دلشاد علی خان وغیرہ اہم کردار ہیں۔ اب ہم ان اہم کرداروں کے حوالے سے مابعد نو آبادیات کا جائزہ لیں گے۔

ٹراما

اُردو ادب کی بات کریں تو بے شمار تخلیقات میں ہمیں ٹراما نظر آتا ہے جیسے منٹو اور زاہدہ حنا کے افسانے، مستنصر حسین تارڑ اور عبد اللہ حسین کے ناولوں میں بھی قرۃ العین حیدر کا ناول گردشِ رنگِ چمن ایک ایسا ہی ناول ہے جس میں ہمیں انفرادی اور اجتماعی ٹراما نظر آتا ہے۔ ٹراما کسی خوفناک حادثے کا جذباتی رد عمل ہے۔ ٹراما دو طرح کا ہوتا ہے:

۱۔ انفرادی ٹراما ۲۔ اجتماعی ٹراما

انفرادی ٹراما: ایسی کوئی بھی وجہ، حالات یا واقعات جس کی وجہ سے ہم ڈپریشن میں چلے جائیں انفرادی ٹراما کہلاتا ہے۔

اجتماعی ٹراما: ایسا ٹراما ہوتا ہے کہ جس میں پورا گروہ، قبیلہ، نسل یا قوم ایسے حالات سے گزرتی ہے جو ان کی پہچان اور سوچ کو اجتماعی طور پر ہمیشہ کے لئے بدل دے۔ مثال کے طور پر ہٹلر نے یہودیوں کا قتل عام کیا۔ پوری قوم ٹراما سے گزری۔ ۱۸۵۷ء کا آشوب ہمارے سامنے ہے۔

ناول کے آغاز میں ہی ہمیں اجتماعی ٹراما کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برصغیر کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا جس میں برصغیر میں مقامی حکمرانی ختم کر دی اور انگریز برسرِ اقتدار آئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد دلنواز بیگم اور مہرو جیسی بے شمار لڑکیاں شرافت کی زندگی ترک کر کے منوری کشمیرن کے ہتھے چڑھ کر طوائف کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

> ”تو یہ ہے رائے صاحب۔ آپ مجھے کیا پیشہ ور نائیکہ سمجھتے ہیں؟ میں بھی ایک شریف زادی دفعتاً مہرو روہانسی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ دونوں صاحبات متعجب نظر آئے۔ رائے صاحب نے گھبرا کر کہا معاف کیجئے گا ہمیں معلوم نہ تھا۔۔۔ مہرو نے گلوریاں بنا کر پیش کیں۔ کچھ دیر سوچا کیں پھر بولیں سنہ ستاون طغرل بیگ کی سرا سے جب نکلے، دلنواز اور مہرو کو کون جانتا تھا۔۔۔ ہم جیسی ہزاروں پر کیا کیا گزری۔ غدر کو لوگ بھول بھال گئے۔ چند الفاظ میں اپنا قصہ سنایا۔“(۴)

ناول میں کئی بار انفرادی ٹراما کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ ناول میں دلنواز بیگم ایک حادثے کا شکار ہوتی ہے اور اس کے جسم کا تین چوتھائی حصہ جل جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ توبہ تائب ہو کر طوائف کی زندگی ترک کر کے حج کے لئے روانہ ہو جاتی ہے اور پیش آنے والی مشکلات کو ثابت قدمی سے برداشت کرتیں ہیں۔

انفرادی ٹراما ہمیں نواب فاطمہ عرف نواب بائی کے کردار میں اُس وقت جب وہ عالمِ نزاع میں مبتلا ہوتی ہے اور بار بار تھوہر کا ساگ پکارتی ہیں جو دوزخیوں کا کھلایا جائے گا تو ان کی بیٹی عندلیب بانو یہ سوچتی ہے کہ مما تو شریف گھرانے میں پیدا ہوئی، ان کے والد عطر فروش تھے۔ ان کو اس ماحول تک لانے والے سبط احمد خان جو ان کے والد کے دوست تھے اور جنہوں نے ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا اور عبدالباسط کے حوالے کر دیا۔ عبدالباسط نے کچھ عرصے کے بعد اس معصوم لڑکی پر بدچلنی کا الزام لگا کر گھر سے باہر

نکال دیا۔ شادی کے نام پر ایندرے رینال نے دھوکہ دے دیا۔ ساری جائیداد ہتھیالی۔ نواب بائی نے ساری زندگی دوسروں سے دھوکے کھائے۔ تھوہر کے اصل حقدار تو یہ لوگ ہیں۔

> ''مولوی صاحب بھی پہچان گئے۔ عجیب چیز تھے۔ پلٹ کر بولے آخری خواہش۔ اجی میم صاحب وہ تو ابھی جہنم میں پوری ہو جاتی ہے۔ تھوہر کا ساگ اہلِ دوزخ کو زبردستی کھلایا جائے گا۔ یہ ابھی سے مانگ رہی ہے۔۔۔۔ توبہ توبہ ان کا چہرہ سارا گل چکا ہے۔ اکثر زنان فاحشہ کا مرنے سے قبل جسم کا کوئی حصہ سڑ گل جاتا ہے۔''(۵)

ٹراما ہمیں عندلیب بیگ کے کردار میں بھی نظر آتا ہے۔ جب اُس کا شوہر سید شکور حسین اُسے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی شک میں مبتلا ہو کر وہ اُسے بچی سمیت گھر سے نکال دیتا ہے۔

مزاحمت

مزاحمت کسی بھی ناموافق صورتِ حال کو اپنانے سے انکار ہے۔ مزاحمت ہمیں نواب فاطمہ کے کردار میں نظر آتی ہے۔ جب عبد الباسط اس کی شادی اپنے ملازم ممدو سے طے کرتے ہیں۔ نواب فاطمہ ممدو کو ناپسند کرتی ہے اور اس سے شادی کرنے کے لئے رضامند نہیں لیکن مجبور ہے اور فیصلہ کرتی ہے کہ شادی سے ایک دن پہلے کنویں میں چھلانگ لگادے گی لیکن ممدو سے شادی نہیں کرے گی۔

> ''اس رات جب سب سو گئے نوابن کھٹولی سے اُٹھی۔ تاروں کی چھاؤں میں دبے پاؤں چلتی جا کر کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔۔۔۔ سارا دلی شہر سویا پڑا تھا۔ اس وقت اس نے محسوس کیا کی ساری دنیا دشتِ ماریہ اور اس میں وہ تنہا کھڑی ہے اور اس سے زیادہ ستم رسیدہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لمحے اس نے طے کیا کہ کم از کم ایک دن قبل بتائیں گے کہ نکاح ہو رہا ہے بس رات کو چپکے سے آ کر اسی کنویں میں کود جاؤں گی۔ یہ طے کر کے اُسے ذرا سکون سا ملا اور وہ واپس آ کر اپنی کھٹولی پر پڑ گئی۔''(۶)

نواب فاطمہ کو عبد الباسط کے گھر رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک دن جمعہ کے وعظ میں ملانے فرمایا تھا کہ عورت ذات انسان نہیں۔ مرد سے کمتر درجے کی مخلوق ہے۔ ناقص العقل اس وجہ سے اس کا دین بھی ناقص ہے۔ یہاں بھی نواب فاطمہ کے کردار میں مزاحمت نظر آتی ہے کہ میں انسان ہوں۔ بھیڑ بکری گائے بھینس کی طرح کوئی شے نہیں ہوں۔

مزاحمت ہمیں عندلیب بانو کے کردار میں بھی نظر آتی ہے جو بازاری زندگی ترک کر کے گھریلو زندگی اختیار کرتی ہے اور اسی مقصد کے لئے سید مشکور حسین سے شادی کرتی ہے۔ لیکن یہ شادی کامیاب نہیں ہو پاتی اور اس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلتا ہے۔

شناخت کا مسئلہ

نو آبادیاتی عہد میں آباد کار محکوم قوموں کی شناخت ختم کرنے اور ان کی تشخص کو پامال کرنے کے لئے ایسی طریقے اور ذرائع استعمال کرتا ہے کہ ایک عام فہم و فراست والا یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ آیا یہ طریقے اس کی بھلائی کے لئے لاگو کئے جارہے ہیں یا اس میں آباد کار کا اپنا مفاد و بھلائی شامل ہے۔ شناخت کسی بھی قوم کی تہذیب ہوتی ہے۔ ناول "گردشِ رنگِ چمن" شناخت کا مسئلہ سب سے پہلے ڈاکٹر منصور کے ہاں نظر آتا ہے۔

"ڈاکٹر منصور بخاری سے کاشغری کیسے بنے۔"

"وہ۔ ہاں تو والدین کا انتقال ہو چکا تھا مدرسہ فتحپوری میں مرزا منصور احمد لکھوایا گیا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں نے بخاری کی بجائے کاشغری کا اضافہ کیا۔ بخاری بہت common نام تھا۔"

"تو اس طرح آپ گویا روسی کے بجائے چینی نژاد ہو گئے۔"

"جی ہاں۔ اس وقت ہندی چینی بھید بھائی بھائی بھی تھے۔"

"میرا جوتا ہے جاپانی، میرا کوٹ ہے انگلستانی، سر پہ لال ٹوپی روسی، پر دل ہے ہندوستانی۔"(۷)

دلنواز بیگم جو اپنے زمانے کی جانی مانی طوائف تھیں۔ طوائف کی زندگی چھوڑ کر مکمل پردہ کرتی ہیں اور ایک نئی شناخت حجن بی اختیار کر لیتی ہیں۔ نئی شناخت قائم کرنے کے لئے حجن بی کو بہت کوشش اور محنت کرنا پڑتی ہے لیکن ماضی انسان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا یہی صورتحال ہمیں دلنواز بیگم کے کردار میں نظر آتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے جہاں مسلمانوں میں اجتماعی ٹراما کی کیفیت پیدا کی وہیں سینکڑوں لڑکیوں کو شرافت کی زندگی چھوڑ کر طوائف کے کوٹھے پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دلنواز بیگم اور مہرو بھی ایسی ہی بدقسمت لڑکیوں میں شامل تھیں۔

غدر سے قبل پردے کی اتنی شدت نہیں تھی لیکن غدر ہندوستان کے بعد مسلم سماج کی تباہی اور کرچین مشنریوں کا خوف۔ ایام غدر میں مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھانجا، بھتیجا، بڈھا، جوان، لنگڑا، جولاہا جو ہاتھ آیا اس سے کر دیں تاکہ وہ بے عزت ہونے بچ سکیں۔ ان گنت لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ اس کی یاد مسلمانوں میں تازہ تھی۔

عنبرین کو سکول میں داخل کروانے کا مرحلہ آتا ہے تو وہاں یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ باپ کے نام کی جگہ کس کا نام لکھوایا جائے کیونکہ سید شکور حسین عنبرین کو اپنی بیٹی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور ماں بیٹی کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ سکول میں داخلے کے وقت عندلیب عنبرین کے ولدیت کے خانے میں اپنے نانا دلدار علی بیگ کا نام لکھواتی ہے اور بعد میں یہ نام مستقل ان کا حصہ بن جاتا ہے۔ اب بیٹی عنبرین بیگ اور ماں مسز بیگ کہلوانا پسند کرتی ہیں۔ اب دونوں کی مستقل شناخت یہی نام ہیں۔

> ”طلاق دے کر گھر سے نکالتے وقت انہوں نے امی سے کہا تھا ان کو یقین نہیں کہ لڑکی انہی کی ہے۔ امی نے جواب دیا تھا بہت ٹھیک۔ اب اس لڑکی کا بالکل کلیم نہ کیجئے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!۔ یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔“
>
> چنانچہ جب میں پانچ سال کی ہوئی اور پٹوہاؤس کے کنڈر گارٹن میں میرا نام محض عنبرین بیگم لکھایا گیا۔ باپ کا نام مسٹر بیگ اپنے نانا مرزا دلدار بیگ عطر فروش نام رقصی کے ذہن میں محفوظ تھا۔ لہٰذا ہمارا گوہا خاندانی نام بیگ ہو گیا۔ بعد میں امی خود کو مسز بیگ کہلوانے لگیں۔۔۔۔نام۔۔۔۔عزت کا پاسپورٹ ہے۔“(۸)

بائنری Binaries

بائنری کا مطلب دو تضادات کا اکھٹا ہونا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعے میں جو بائنری بنائی گئی وہ استعمار کار اور استعمار زدہ یعنی حاکم اور محکوم کے درمیان تھی۔ اس بائنری کے ایک جانب تعلیم یافتہ، تہذیب یافتہ، متمدن اور ترقی یافتہ نو آبادکار تھا تو دوسری طرف جاہل، اجڈ، غیر متمدن اور غیر مہذب نو آبادیاتی باشندے تھے۔ اس ناول میں ایک طرف شرفا اور دوسری طرف طوائفیں۔ شرفا طوائف کے کوٹھوں پر بڑے ذوق و شوق سے جاتے ہیں لیکن انہیں اپنے گھر کی زینت بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اس ناول میں مشرق اور مغرب کے مابین جدیدیت اور روایت، کالے اور گورے، ہم اور دیگر، اشرافیہ اور عوام، سرمایہ پرستی اور ماکسزم جیسی جوڑے دار، اضداد یعنی بائیزیز اپنی پوری شدت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ گردشِ رنگ چمن کو نو آبادیاتی تناظر میں انگریزوں کی بنائی بائنری اور مشرق کی جانب ان کے رویے کے ایک آئینے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جو پوری نو آبادیاتی سوچ اور مقامی معاشرے کے رد عمل کے حوالے سے بہت سے سوالات جنم دیتا ہے۔

استعمار کار برصغیر میں اپنی تجارتی، سیاسی اور عسکری حکمت عملی کے تحت آئے اور یہاں کے معاشرے اور تہذیب کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ انہوں نے یہاں استحصال کرنے کے لئے عام لوگوں اور نو آبادکاروں کے درمیان افتاد کی خلیج حائل کی اور استعمار زدہ کو ان کی کمتری کا احساس دلاتے ہوئے اپنی برتری کا احساس قائم کیا۔

ماحصل

مصنفہ ناول کو جدھر چاہتی ہے اس کا رخ موڑنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ماضی اور حال تک لانے کی تکنیک میں یقیناً بڑی مہارت رکھتی ہیں۔ ان کا یہ ناول ماحول اور مزاج کے اعتبار سے ایک عمدہ تخلیق ہے۔ گردشِ رنگِ چمن میں ہر چھوٹے بڑے کرداروں نے ناول کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کرداروں میں اتار چڑھاؤ کا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔

پانی کی طرح بہتی ہوئی نسلوں کی یہ کہانی ماضی سے حال تک پھیلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر منصور کاشغری، ڈاکٹر عنبرین بیگ اور وہ سب جو اس ناول کا کردار میں دراصل تاریخ کا وہ چہرہ ہیں جنہیں قرۃ العین نے یکجا کر کے گردش رنگِ چمن کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اگر یہ کردار نہ ہوتے تو کس کو پتہ چلتا، پانی کی طرح بہتی ہوئی نسلیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں ہیں۔

بہر کیف اس ناول کو مصنفہ نے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہندوستان کے حالات اور کوائف کو بڑی برجستگی اور فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس کے ذریعہ ہماری خود آگاہی اور بے خبری کو جھنجوڑ کر رکھ دینے کی بھرپور کوشش کی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ غلام قادر، ڈاکٹر، حسن منظر کے افسانوں کا نو آبادیاتی تجزیہ، ایکسپریس نیوز جون

۲۔ مرزا خلیل احمد بیگ، ادبی تنقید کے لسانی مضمرات، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۴

۳۔ صدیق الرحمن قدوائی، قرۃ العین حیدر، ادیبوں کے تاثرات (مضمون)، مشمولہ، ماہ نامہ اُردو دنیا، جلد نمبر ۹، شمار ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۴۔ قرۃ العین حیدر، گردش رنگِ چمن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۲ تا ۱۷۳

۵۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۷۔ ایضاً، ص ۳۳

۸۔ ایضاً، ص ۳۰۴